آبادی کا عالمی منظر نامہ

محمد الیاس انصاری

حضرت انسان بھی خوب ہیں۔ اس بات پر پریشان رہے کہ آبادی میں اضافہ ہوتا جائے گا اور یہ بم پھٹے گا تو کیا ہوگا؟ یا اب اس پر پریشان ہیں کہ آبادی کم ہوتی گئی (اور بوڑھی نسل میں اضافہ ہوتا گیا) تو اس دنیا کا کیا بنے گا؟ اللہ تعالیٰ کے کام مقررہ اندازوں سے ہوتے ہیں لیکن بندہ اپنی عقل و دانش سے ان اندازوں کو بگاڑتا ہے اور پھر ان کے نتائج بھگتتا ہے۔

وسط ستمبر ۲۰۰۴ء میں اقوام متحدہ نے انتباہ جاری کیا کہ دنیا کے بڑے شہروں کی آبادی میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے۔ لاگوس کی آبادی ۱۹۹۵ء میں ۶۵ لاکھ تھی' جو ۲۰۱۵ء تک ایک کروڑ ۶۰ لاکھ ہونے کا امکان ہے۔

یہ مکمل کہانی نہیں ہے' حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں خاندانوں میں اولاد کی تعداد کم سے کم تر ہوتی جارہی ہے۔ شرح افزائش میں ۱۹۷۲ء کے مقابلے میں آدھی سے زیادہ کمی واقع ہو چکی ہے۔ پہلے ایک عورت چھے بچوں کو جنم دیتی تھی اب وہ اوسطاً صرف ۲ء۹ بچوں کو جنم دیتی ہے۔ ماہرین آبادی کے مطابق اس تعداد میں تیزی سے مزید کمی واقع ہوتی جارہی ہے۔

دنیا کی آبادی میں اضافہ بہرحال جاری رہے گا۔ آج دنیا کی آبادی ۶ ارب ۴۰ کروڑ ہے جو ۲۰۵۰ء میں ۹ ارب تک جا پہنچے گی۔ اس کے بعد آبادی میں بہت تیزی سے کمی ہونا شروع ہو جائے گی۔ اُس وقت آبادی کی کمی کے اثرات سامنے آجائیں گے تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تدابیر کی جائیں گی۔ کئی ممالک میں یہ عمل پہلے ہی شروع ہو چکا ہے۔ آبادی کا یہ نیا توازن قوموں کی قوت' عالمی معاشی افزایش' ہماری زندگیوں کا معیار' غرض دنیا کی ہر چیز کو تبدیل کر دے گا۔

یہ انقلابی تبدیلی ترقی یافتہ ممالک نہیں' بلکہ ترقی پذیر ممالک کے ذریعے آئے گی۔ ہم میں سے اکثر لوگ آبادی کے رجحانات کے حوالے سے یورپ کے بارے میں آگاہ ہیں جہاں برسوں سے شرح پیدایش میں کمی

آتی جارہی ہے۔اس توازن کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ یورپ کی ہر عورت کے ہاں ۲ء۱ بچے پیدا ہوں مگر یورپ میں شرح پیدائش اس سے بھی کہیں کم ہے۔اقوام متحدہ کی آبادی رپورٹ ۲۰۰۲ء کے مطابق فرانس اور آئرلینڈ ۸ء۱ بچوں کے تناسب سے یورپ میں سب سے بلند شرح پیدائش' جب کہ اٹلی اور اسپین ۲ء۱ بچوں کے تناسب سے یورپ میں سب سے کم شرح پیدائش کے حامل ممالک ہیں' جب کہ ان کے درمیان جرمنی جیسے ممالک ہیں جن کی شرح پیدائش ۴ء۱ کے تناسب سے یورپ کی اوسط کے مطابق ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ اگلے ۴۰ برسوں میں جرمنی کی کُل ۸ کروڑ ۲۵ لاکھ آبادی میں سے پانچواں حصہ کم ہو جائے گا۔

یہی صورت حال پورے یورپ میں ہے۔بلغاریہ کی آبادی میں ۳۰ فی صد' رومانیہ میں ۲۷ فی صد' جب کہ ایسٹونیا میں ۲۵ فی صد کمی ہوگی۔مشرقی یورپ کے بعض خطے جو پہلے ہی کم آبادی کا شکار ہیں' ان کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ 'بیابان' میں تبدیل ہو جائیں گے۔

یہ اندازے اور تخمینے برلن انسٹی ٹیوٹ فار پاپولیشن اینڈ ڈویلپمنٹ کے ڈائرکٹر Reiner Klingholz کے ہیں۔روس پہلے ہی سالانہ ساڑھے سات لاکھ آبادی کی کمی کا شکار ہو رہا ہے۔روسی صدر نے اس صورت حال کو ''قومی بحران'' قرار دیا ہے۔یہی حالت مغربی یورپ کی بھی ہے جہاں زیادہ نہیں تو اس صدی کے وسط تک سالانہ ۳۰ لاکھ لوگوں کی کمی ہو جایا کرے گی۔

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی اسی روش کو نہایت تابعداری کے ساتھ اندھوں کی طرح اپنا رہے ہیں۔جاپان جلد ہی آبادی کے خسارے سے دوچار ہونے والا ہے۔اقوام متحدہ کے تخمینوں کے مطابق اگلے چار عشروں میں جاپان اپنی موجودہ ۳ء۱ شرح پیدائش کے سبب ۱۲ کروڑ ۷۰ لاکھ کی آبادی کا ایک چوتھائی کھو بیٹھے گا۔مگر چین کا کیا کیا جائے جہاں ۱۹۷۰ء میں شرح پیدائش ۵ء۸ تھی' آج گھٹ کر ۸ء۱ رہ گئی ہے۔چین کی مردم شماری سے حاصل ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق شرح پیدائش اس سے بھی کم یعنی ۳ء۱ ہے۔دوسری جانب اوسط عمر میں اضافہ ہونے کے باعث بوڑھوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوتا جا رہا ہے کہ چین کی ایک ہی نسل میں جتنے لوگ بوڑھے ہوں گے وہ پورے یورپ میں ایک سو سال میں نہیں ہوئے ہوں گے۔چین اور جاپان کے بارے میں یہ اعداد و شمار نہایت مستند ادارے Centre for Strategic and International Studies واشنگٹن نے اپنی ایک رپورٹ میں شائع کیے ہیں۔جسے نیوز ویک نے ۲۷ ستمبر ۲۰۰۴ء کے شمارے میں نقل کیا ہے۔

۲۰۱۵ء میں چین امریکا سے زیادہ بوڑھا ہوگا' یعنی چینی بوڑھے بہت زیادہ تعداد میں ہوں گے۔۲۰۱۹ء یا اس کے آس پاس چین کی آبادی اپنی انتہا کو چھوتے ہوئے ڈیڑھ ارب تک جا پہنچے گی۔(اس وقت ۲۰۰۵ء میں

چین کی کل آبادی ایک ارب ۳۰ کروڑ ۳۴ لاکھ ۵۸ ہزار ۵ سو ۲۷ ہے)۔صدی کے درمیان تک چین کی آبادی فی نسل کے حساب سے ۲۰ سے ۳۰ فی صد گھٹتی جائے گی۔

ایسی ہی صورت حال ایشیا کے ان ممالک میں بھی ہے جہاں چین کی طرح تحدید آبادی کے سخت گیر قوانین اور پالیسیاں نافذ نہیں ہیں۔ترقی یافتہ صنعتی اقوام مثلاً سنگاپور ٗہانگ کانگ ٗ تائیوان اور جنوبی کوریا میں نسلِ انسانی کی افزائش میں کمی کا رجحان بیان کیا جارہا ہے۔یہ حقائق واشنگٹن کے American Enterprise Institute کے ماہر آبادیات نکولس ایبرسٹیٹ کے بیان کردہ ہیں۔اس فہرست میں تھائی لینڈ ٗبرما ٗ آسٹریلیا ٗ سری لنکا ٗ کیوبا ٗ متعدد کیریبین (Caribbean) اقوام اور اسی طرح یوروگوئے اور برازیل کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔میکسیکو اس قدر تیزی سے بوڑھا ہورہا ہے کہ اگلے چند عشروں میں نہ صرف یہ کہ اس کی آبادی میں اضافہ رک جائے گا ٗ بلکہ امریکا کے مقابلے میں یہاں آبادی کہیں زیادہ بوڑھوں پر مشتمل ہوگی۔ایبرسٹیٹ کے بقول ''اگر یہ اعداد و شمار درست ہیں تو پھر دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی ایسے ممالک کے اندر رہ رہی ہوگی جہاں مرنے والوں اور پیدا ہونے والوں کی تعداد یکساں ہو یعنی نہ کمی نہ اضافہ۔ان اعداد و شمار میں کچھ مستثنیات بھی ہیں ٗ مثلاً یورپ میں البانیہ اور کوسووا میں آبادی کی افزائش صحیح انداز سے جاری ہے۔اسی طرح سے کچھ خطے ایشیا میں بھی ہیں ٗ مثلاً منگولیا ٗ پاکستان اور فلپائن۔

اقوام متحدہ کا اندازہ ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کی آبادی اگلے بیس برسوں میں دُگنی ہوجائے گی۔مشرقِ وسطیٰ کی موجودہ آبادی ۳۲ کروڑ ۶۰ لاکھ ہے جو ۲۰۵۰ء میں بڑھ کر ۶۴ کروڑ ۹۰ لاکھ ہوجائے گی۔دنیا میں سب سے زیادہ شرح پیدائش والا ملک سعودی عرب ہے جس کی شرح ۵ء۷ ہے۔اس کے بعد فلسطینی علاقے ہیں جہاں یہ شرح ۵ء۴ ہے۔پھر یمن کی باری آتی ہے۔

کچھ چیزیں حیرت انگیز بھی ہیں۔مثلاً تیونس کم آبادی والے ممالک میں جاچکا ہے۔(تیونس کی موجودہ آبادی ایک کروڑ سے کچھ زائد ہے)۔لبنان اور ایران آبادیاتی خسارے کی دہلیز پر ہیں۔مجموعی طور پر اس خطے کی آبادی میں اگرچہ اضافہ جاری ہے لیکن اس کی وجہ پیدائش کے وقت بچوں کی وفات کی شرح میں کمی ہے۔ترقی یافتہ ممالک کے مقابلے میں یہاں شرح پیدائش تیزی سے گھٹ رہی ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ آنے والے عشروں میں مشرق وسطیٰ میں بھی دنیا کے دوسرے خطوں کے مقابلے میں بوڑھوں کی تعداد زیادہ ہوگی۔

افریقہ میں شرح پیدائش بلند ہے۔ایڈز کی وبا کے پھیلاؤ کے باوجود اندازہ ہے کہ افریقہ کی آبادی میں اضافے کی رفتار جاری رہے گی اور یہی معاملہ امریکا کا ہے۔

ماہر سماجیات بین ویٹن برگ (Ben Wattenberg) Fewer: How the new

Demography of Depopulation will shape our future میں لکھتا ہے کہ ''سیاہ طاعون کے زمانے سے لے کر اب تک کے ۶۵۰ برسوں میں شرح پیدائش اور بارآوری (fertility) کی شرح آج تک اتنی تیزی سے اتنے مقامات پر کبھی نہیں گری۔

اقوام متحدہ کی مذکورہ رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر جگہ لوگ دیہات سے شہروں کی جانب نقل مکانی کر رہے ہیں۔ یہ شہر ۲۰۰۷ء تک دنیا کی کُل آبادی کا نصف سموئے ہوئے ہوں گے۔ پھر شہروں میں بچے پالنا نفع بخش کام کے بجائے نقصان کا سودا ہوگا۔

۱۹۷۰ء سے ۲۰۰۰ء کے دوران نائیجیریا کی شہری آبادی ۱۴ فی صد سے بڑھ کر ۴۴ فی صد تک جا پہنچی۔ جنوبی کوریا میں یہ ۲۸ فی صد سے ۸۴ فی صد پر چلی گئی۔ لاگوس سے لے کر نیومیکسیکوسٹی تک نام نہاد عظیم شہروں کی آبادیوں میں دیکھتے دیکھتے حیرت انگیز اضافہ ہوگیا مگر ملک کی مجموعی آبادی کی شرح پیدائش میں کمی آ گئی۔ پھر دوسرے عوامل بھی اپنی جگہ کارفرما ہیں مثلاً خواتین میں شرح تعلیم میں اضافے اور اسکولوں میں بچیوں کے داخلے کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے شرح پیدائش میں کمی آ گئی ہے۔ اسی طرح دنیا بھر میں دیر سے شادی کرنے کے رجحان کے ساتھ ساتھ اسقاطِ حمل اور طلاق نے بھی آبادی میں اضافے کی رفتار کو کم کر دیا ہے۔ گذشتہ عشرے میں مانع حمل آلات اور ادویات کے استعمال میں ڈرامائی طور پر اضافہ ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کے اعداد و شمار کے مطابق ۶۲ فی صد شادی شدہ یا inunion (ایسی خواتین جو شادی کے بغیر مردوں کے ہمراہ زندگی گزاریں) خواتین جو بچے پیدا کرنے کی عمر کی حامل ہیں' اب غیر فطری ضبطِ تولید کے ذرائع استعمال کر رہی ہیں۔ ہندستان جیسے ممالک میں جو ایچ آئی وی (ایڈز وائرس) کے عالمی دارالحکومت کی شکل اختیار کر گئے ہیں وہاں یہ وبا کی تحدید آبادی میں ایک عنصر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔

روس میں تحدید آبادی کے عوامل میں شراب نوشی' گرتی ہوئی صحت اور صنعتی آلودگی شامل ہے جو مردوں کی مجموعی تولیدی صلاحیت (sperm counts) کے بگاڑ کا اصل سبب ہیں۔

دولت بچوں کی پیدائش کی حوصلہ شکنی کرتی ہے۔ یہ چیز یورپ میں ایک عرصے سے دیکھی گئی اور اب ایشیا میں بھی یہی صورت حال پیدا ہو رہی ہے۔ ماہر سماجیات وین برگ کے بقول ''سرمایہ داری بہترین آلۂ مانع حمل ہے'' (Capitalism is the best contraceptive)۔

آبادی کی یہ صورت حال اپنے اندر کیا مضمرات سمیٹے ہوئے ہے اور عالمی معیشت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ اس بارے میں فلپ لونگ مین (Philip Longman) نے اپنی ایک حالیہ کتاب *The Empty Cardle: How Falling Birth Rates Threaten World*

'Prosperity and What to do about it' یعنی ''خالی پنگوڑے: گرتی ہوئی شرح پیدائش دنیا کی خوشحالی کے لیے کس طرح خطرہ ہیں اوراس کا حل کیا ہے؟'' میں تفصیلات بیان کی ہیں۔

فلپ لانگ مین نیوامریکا فاؤنڈیشن واشنگٹن میں ماہر آبادیات ہے۔ وہ آبادی کے اس رجحان کو عالمی خوش حالی کے لیے ایک خطرہ تصور کرتا ہے۔ چاہے جایداد کا کاروبار ہو یا صارفین کی جانب سے کیے جانے والے اخراجات۔ معاشی ترقی اور آبادی کا باہمی قریبی تعلق ہوتا ہے۔ فلپ نے بڑے خوب صورت انداز میں ایک بات کہی ہے کہ ''ایسے لوگ بھی ہیں جو اس امید سے چپکے ہوئے ہیں کہ متحرک معیشت بڑھتی ہوئی آبادی کے بغیر ممکن ہے مگر ماہرین اقتصادیات کی اکثریت اس بارے میں قنوطیت پسند ہے''۔

ماہرین آبادیات کی پیشن گوئی کے مطابق اٹلی میں اگلے چار عشروں میں کام کے قابل آبادی میں ۴۰ فی صد کمی آئے گی، جب کہ یورپی کمیشن کے مطابق براعظم یورپ میں بھی اتنی ہی کمی واقع ہوگی۔ پھر جب ۲۰۲۰ء میں بچوں کی افزائش میں اضافے کے خواہش مند ریٹائر ہو جائیں گے تو اس وقت کیا بنے گا؟ جرمنی، اٹلی، فرانس اور آسٹریا میں ۲۰۰۴ء میں پنشن کے حوالے سے اصلاحات کے ضمن میں ہونے والی ہڑتالوں اور مظاہروں کو یورپ کے بزرگوں اور آنے والی نسلوں کے درمیان بڑی سماجی لڑائیوں کے اندیشے کا آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کا موازنہ چین سے کیا جائے تو پھر یہ تو محض ایک چھوٹی جھڑپ ہوگی کیونکہ چین میں بوڑھے زیادہ ہوں گے اور وہاں ایسے حقوق کی جنگ شدید ہوگی۔ چین میں مارکیٹ اصلاحات نے ''جھولے کی جگہ قبر'' کے فوائد کی طرف توجہ دینا شروع کر دی ہے، جب کہ کمیونسٹ پارٹی نے معقول سماجی حفاظتی نظام روبہ عمل لانے کے لیے ترتیب ہی نہیں دیا ہے۔ CSIS کے مطابق ریٹائرمنٹ پر پنشن کی سہولت ملک کی ایک چوتھائی سے بھی کم آبادی کو حاصل ہے جس کی وجہ سے بزرگوں کی دیکھ بھال کا تمام بوجھ اس نسل پر ہوگا جو اس وقت بچے ہیں۔

چین کی ''ایک بچہ پالیسی'' نے نام نہاد ''۱-۲-۴ مسئلہ'' کی سمت اختیار کر لی ہے۔ اس مسئلے میں آج کا بچہ آنے والے کل میں اپنے والدین اور چار دیگر افراد یعنی دادا، دادی اور پڑدادا پڑدادی کی دیکھ بھال کا ذمہ دار ہوگا۔ چین میں آمدنیاں اس بوجھ کی تلافی کے لیے تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہیں۔ کچھ نوجوان دیہات سے نکل کر شہروں کا رخ کر گئے ہیں جس کی وجہ سے ایسے گھرانوں کے بزرگوں کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ پھر بوڑھی ہوتی ہوئی چینی آبادی جلد ہی چین کی عالمی کاروباری مسابقت کو گہنا دے گی کیونکہ چین کی معاشی ترقی کا اس وقت انحصار نہ ختم ہونے والی مسلسل سستی لیبر فورس کی فراہمی پر ہے۔ مگر ۲۰۱۵ء کے بعد اس لیبر فورس کی فراہمی کا سلسلہ ٹھنڈا پڑنا شروع ہو جائے گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جو چینی ماہر اقتصادیات ہوانگا نگ (Hu Angang) نے بیان کی ہیں۔ اُن کے مطابق اس مسئلے سے نبٹنے کے لیے چین تقریباً بے اختیار ہوگا۔ اس کا

حل چین کو نہایت مغربی انداز میں اختیار کرنا ہوگا یعنی اسے اپنی ورک فورس کا تعلیمی معیار بلند کرنا ہوگا اور زیادہ پیداواری بنانا ہوگا۔ مگر کیا ایسا ممکن ہے؟ یہی دراصل ایک واضح سوال ہے۔ مغربی حل بھی بالآخر منفی شرح پیدائش پر منتج ہوگا اور بات وہیں آ جائے گی کہ بوڑھوں کی فوج اور نوجوانوں کا خاتمہ۔ بہرحال صورت حال خواہ کچھ بھی ہو' مگر یہ بات تو یقینی ہے کہ ایشیا کی اُبھرتی معاشی قوتوں میں سے چین اپنے امیر ہونے سے پہلے ہی بوڑھا ہو جائے گا۔

ماہر اقتصادیات اور سب سے زیادہ فروخت ہونے والی حالیہ کتاب *The Economy of a Shrinking Population* کے جاپانی مصنف آکی ہیکو میٹسو ٹانی (Akihiko Matsutani) نے پیش گوئی کی ہے کہ جاپان کی معیشت ۲۰۰۹ء تک ''منفی ترقی'' (Negative Growth) کے عہد میں داخل ہو جائے گی۔ ۲۰۳۰ء تک قومی آمدن ۱۵ فی صد تک سکڑ جائے گی۔

جاپان میں شرح زچگی مسلسل چوتھے سال بھی کم ہوئی ہے اور اب یہ کمی ریکارڈ حد تک گر گئی ہے۔ ۲۰۰۳ء میں جاپان کی شرح زچگی ۲۹ء۱ ہوگئی تھی اور ۲۰۰۴ء میں ۲۸ء۱ ہوئی۔ اس شرح سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اوسطاً جاپانی عورت کے کتنے بچے ہوں گے۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ اس شرح میں کمی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جاپانی حکومت کی زیادہ بچوں کی پیدائش کی مہم ناکام ہوئی ہے۔ جاپان دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جن میں شرح پیدائش بہت کم ہے۔ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے جاپان کی حکومت نے کئی ایسے منصوبے شروع کیے ہیں جن سے والدین کو بچوں کو سنبھالنے اور دیکھنے میں مدد ملے۔ ان میں ملازمت کرنے والی ماؤں کے لیے چائلڈ کیئر سنٹرز اور دیگر سہولتیں شامل ہیں۔ لیکن جاپانی خواتین کہتی ہیں کہ محض ان سہولتوں کی موجودگی سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ان کا اصل مسئلہ معاشرے میں روایتی توقعات سے ہے۔ مردوں سے توقع کی جاتی ہے کہ دفتر میں دیر تک کام کریں' جب کہ خواتین سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ بچے کی پیدائش کے بعد نوکری بالکل چھوڑ دیں۔

غور و فکر کیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ایسے ممالک کا مستقبل خطرے میں ہے اور ماہرین اقتصادیات کے سامنے بہت تیکھے سوالات ہیں مثلاً جاپان کی مشہور زمانہ بلند ترین بچتوں کا معاملہ ہی لیں جن کے باعث جاپانی معیشت ہمیشہ محفوظ رہی ہے اور ان بچتوں سے دنیا بھر نے خصوصاً امریکا نے ادھار لے کر سرمایہ کاری کی ہے۔ اب جب کہ جاپان کا بڑھاپا قریب تر آتا جا رہا ہے' تو کیا ایسی صورت میں وہ اثاثے جو جاپانیوں کے ہیں ریٹائرمنٹ کی صورت میں انھیں درکار نہیں ہوں گے۔ انھیں واپس کرنے کی صورت میں امریکا میں اور پوری دنیا میں شرح سود میں اضافہ ہوگا۔ کیا جاپانیوں کو خود اپنے ملک میں سرمایہ کاری کے لیے مسابقت کے ماحول میں

قلتِ سرمایہ کا سامنا نہیں ہوگا؟ جاپانی سرمایہ کار آخر کس چیز میں اندرونِ ملک سرمایہ لگائیں گے جب کہ صارفین بوڑھے ہوں گے؟ آخر وہ کون سی نئی چیزیں ان بوڑھوں کو مہیا کریں گے جو پہلے سے موجود نہیں ہیں؟ قومی انفراسٹرکچر پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟ ماہر اقتصادیات میٹسوتانی کی پیش گوئی کے مطابق: ''قومی خزانے میں ٹیکس کی مَد میں حاصل ہونے والے کم محاصل کی وجہ سے حکومتیں مجبور ہوں گی کہ ملک میں سڑکوں، پُلوں، ریلوے لائنوں اور اسی قسم کے انفراسٹرکچر میں تعمیر و مرمت کے حوالے سے اخراجات میں کٹوتی کریں یا پھر کم از کم انھیں ملتوی کر دیں۔ زندگی کم آسان ہوجائے گی۔ نہایت صاف ستھرا ٹوکیو شہر ۷۰ء کے عشرے کا نیویارک جیسا بن کر رہ جائے گا۔ ۷۰ء کے عشرے میں نیویارک کے بہت سے شہری اس شہر کو چھوڑ کر اس کے نواحی علاقے میں چلے گئے تھے جس کی وجہ سے نیویارک اس ٹیکس آمدن سے محروم ہوگیا جو اُس کے شہری ادا کیا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شہر کو چلانے والے ذمہ داران زیادہ دیر تک شہر کے نظم و نسق کی دیکھ بھال نہ کر سکے۔ مگر کیا جاپانی اس مسئلے کا حل تلاش کر سکیں گے؟

آبادیاتی تبدیلیاں ملک کے مسائل کو چاہے وہ سماجی ہوں یا اقتصادی، بہت بڑھا دیتی ہیں۔ بہت زیادہ بوجھ تلے دبی فلاحی ریاست کو بڑھاپے کے مارے لوگ زوال سے دوچار کردیں گے۔

تارکینِ وطن کی آمد کا خیال ہی پریشان کن ہے مگر شرح پیدائش کی یہ تبدیلیاں درآمد شدہ لیبر فورس میں اضافے کی ضرورت کو ظاہر کرتی ہیں جو آنے والے کل میں یورپ کے لیے فیصلہ کن معاملے کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوچنے کی حد تک تو یہ بات دل کو آسان لگتی ہے کہ گھٹتی آبادی والے امیر ملکوں اور آبادی میں اضافہ جاری رکھنے والے غریب ملکوں کے درمیان بڑھتی ہوئی خلیج خود اچھے مواقع پیدا کرے گی۔ لیبر فورس زیادہ آبادی مگر کم وسائل کے حامل جنوب کے ممالک سے ترقی یافتہ شمال کا رخ کریں گے جہاں ملازمتوں کی بہتات کا جاری رہنے والا سلسلہ موجود ہوگا۔ سرمائے اور کمائی سے حاصل شدہ آمدنیاں امیر اقوام سے غریب اقوام تک منتقل ہوں گی جس کا سبھی کو فائدہ ہوگا۔ تصور سے ہٹ کر حقیقی دنیا میں اگر جائزہ لیا جائے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا عملاً ایسا ہو سکے گا؟ آیئے! ذرا اصل صورت بھی دیکھ لیں۔ اگر اہلِ یورپ کی جانب سے شمالی افریقہ سے وسیع پیمانے پر نقل مکانی کے بارے میں مزاحمت پر مبنی حالیہ رویہ مدنظر رکھا جائے اور جاپان کی صفر ترکِ وطن پالیسی بھی ذہن میں رہے تو پھر اوپر بیان ہونے والا خیال درست نہیں لگتا اور اس بارے میں خوش فہمی میں مبتلا رہنا درست نہیں ہے۔

یورپ اور ایشیا کے اکثر حصوں میں جب آبادی گھٹ رہی ہے تو ایسے میں امریکا کی مقامی آبادی (تارکینِ وطن کی آمد کو چھوڑ کر) نسبتاً استحکام کی حامل رہے گی۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ شرح پیدائش میں کمی کے بادل

امریکا پر منڈلاتے رہیں گے۔ اگر تارکینِ وطن کی آنے والی آبادی کو امریکا کی مجموعی آبادی میں شامل کرتے جائیں تو امریکا میں آبادی میں اضافے کی رفتار جاری رہے گی۔ اگلے ۴۵ برسوں میں امریکا کی آبادی میں ۱۰ کروڑ کا اضافہ ہوگا۔ ویٹن برگ کے تخمینوں کے مطابق یورپ اسی عرصے میں تقریباً اتنی ہی آبادی کے خسارے سے دوچار ہوگا۔ اس صورت حال کا مطلب یہ ہرگز نہیں لیا جانا چاہیے کہ آمدہ آبادیاتی تبدیلیوں کی نحوست سے امریکا بچ پائے گا۔ امریکیوں کو بھی بوڑھی ورک فورس اور اس سے متعلقہ مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا' مثلاً صحت اور سوشل سکیورٹی کا خرچہ ۲۰۰۰ء میں کل جی ڈی پی کا ۴ء۳ فی صد تھا جو ۲۰۳۰ء میں بڑھ کر ۵ء۱۱ فی صد جبکہ ۲۰۵۰ء میں امریکی کانگریس بجٹ آفس کے مطابق مزید بڑھ کر ۲۱ فی صد ہو جائے گا۔ اس کا معاشرتی پہلو بھی سامنے رکھا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ممکنہ نسلی تناؤ کا بھی سامنا کرنا پڑے گا۔ امریکا کی جامد سفید فام آبادی اور سیاہ فاموں کی کم ہوتی ہوئی آبادی' اسے امریکا کے کثیر الثقافتی سمندر میں مزید اقلیت میں تبدیل کر دے گی۔ پھر آج کے اس زمانے میں جب اقوام کا انحصار ایک دوسرے پر ہے تو امریکا کے تجارتی شراکت داروں یعنی یورپ اور جاپان کے مسائل بھی خود امریکا کے مسائل بن جائیں گے۔ اس بات کی مثال کچھ یوں دی جا سکتی ہے کہ اس وقت ''چینی منڈی'' ایک بہت ہی بڑی منڈی کے طور پر بیان کی جا رہی ہے اور اسی وجہ سے امریکی کمپنیوں نے چین میں بہت بھاری سرمایہ کاری کی ہوئی ہے۔ ذرا سوچیے کہ اگر ۲۰۵۰ء میں ایک تخمینے کے مطابق چین اپنی ۳۵ فی صد ورک فورس کھو بیٹھے گا اور بوڑھوں کی تعداد بہت زیادہ ہوگی تو پھر ان کمپنیوں کو منافع کی کیا شرح ہاتھ آئے گی؟

امریکا کی آبادیاتی یک قطبی حیثیت خود امریکا کی سلامتی کے حوالے سے گہرے مضمرات رکھتی ہے۔ امریکا کو نام نہاد دہشت گردی اور ناکام ریاستوں کے حوالے سے کافی تشویش ہے۔ لانگ مین نے اپنی کتاب خالی پنگوڑا (The Empty Cradle) میں امریکی رہنماؤں کے حوالے سے نہ حل ہونے والے امکانات کا خاکہ پیش کیا ہے اور کہا ہے کہ ایسی صورت میں امریکا کے لیے ادائیگی میں مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔

ایک طرف یہ تمام حقائق ہیں تو دوسری طرف اس صورت حال کو تسلیم کرنے سے انکاری گروہ بھی موجود ہے۔ اس کے لیے وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ آبادی میں اضافے کی وہ کوششیں جو بعض یورپی ممالک کر رہے ہیں ضرور رنگ لائیں گی اور یوں آبادیاتی عدم توازن پیدا نہیں ہوگا۔ ان کے بقول فرانس اور ہالینڈ نے خاندان دوست پالیسیاں نافذ کی ہیں جو عورتوں کو کام کاج کرنے کے ساتھ ساتھ ممتا کے جذبے کے فروغ میں مددگار ہوں گی۔ ان خاندان دوست پالیسیوں کے تحت فرانس اور ہالینڈ میں ان ماؤں کو اپنے بچوں کو اوقات کار کے دوران ڈے کیئر مرکز میں رکھنے کے لیے' سرکاری مالی معاونت کے ساتھ ساتھ ٹیکسوں میں چھوٹ بھی دی جائے گی۔ سکینڈے نیوین ممالک نے شرح پیدائش کو بلند رکھنے کی غرض سے فراخ دلانہ سہولیات بشمول جز وقتی

ملازمت فراہم کی ہیں۔ ایسی ہی ترغیبات اور پروگرامات سکڑتی آبادی کے حامل ملک سنگاپور نے بھی دی ہیں جن میں دیگر سہولیات کے علاوہ حکومت کے زیرانتظام ’’date service‘‘ بھی ہے مگر اس کے باوجود آبادی میں کمی کی لہر کو اضافے میں بدلنے میں اس ’’سروس‘‘ کا بھی کوئی ’’فائدہ‘‘ نہیں ہوا ہے۔

آبادی کا مسئلہ مسلم اُمت کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مسلمانوں کی دینی تعلیم انھیں تحدید نسل سے روکتی ہے لیکن ان کی حکومتیں مغرب کے احکامات کے تحت تمام سرکاری وسائل اس تحریک کے فروغ میں صرف کر رہی ہیں۔ اس کے اثرات ہیں لیکن اتنے نہیں جتنے خود مغربی معاشروں میں ہوتے ہیں۔ مسئلہ صرف ذاتی یا انفرادی نہیں، اجتماعی اہمیت کا ہے۔ آبادی کی تعداد کی اہمیت ہر دائرے میں اثرانداز ہوتی ہے۔ اس لیے دشمن مسلمانوں کی تعداد کم کرنا چاہتا ہے، جب کہ مسلمانوں کو اپنی تعداد میں مناسب اضافے کی فکر رکھنا چاہیے۔

---

o اسسٹنٹ پروفیسر یونی ورسٹی آف منیجمنٹ اینڈ ٹکنالوجی (UMT)،